فرمان فتح پوری

انیسویں صدی کا ایک تعلیمی مصلح

مولانا سید ظہور الاسلام انیسویں صدی کے ان مصلحین اور تعلیمی مفکرین میں تھے جن کی عملی کوششوں اور روحانی تصرفات نے برصغیر کے مسلمانوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہر چند کہ مولانا ایک درویش خدا مست تھے اور مفاد دنیاوی یا نام و نمود سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و اصلاح سے بے نیاز نہ تھے۔ انہیں اپنے دور کے سارے قومی و ملی معاملات سے عموماً اور مسلمانوں کی تعلیمی و اصلاحی تحریکات سے خصوصاً دلچسپی تھی۔ اسی خیال سے مولانا نے ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں بھی سرسید کے مدرسۃ علیگڑھ سے صرف آٹھ سال بعد مدرسۂ اسلامیہ یا موجودہ مسلم انٹر کالج فتح پور کی بنا ڈالی۔ اس میں مولانا نے علوم اسلامی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ اور کچھ دنوں بعد صنعتی تعلیم کا بھی بابک سکیشن قائم کر دیا۔ وہ مذہب کے سختی سے پابند تھے لیکن مولانا ایسی کوراں تقلید و مذہبی تنگ نظری کا شکار کبھی نہیں رہے جس نے اس زمانے کے اکثر علمائے دین سے اجتہاد فکر اور وسیع النظری چھین لی تھی۔ وہ حالی اور شبلی کی طرح سرسید کے بعض مذہبی معتقدات و خیالات سے اختلاف رکھنے کے باوجود سرسید کی تعلیمی تحریک کے حامیوں میں تھے اور ان کی تعلیمی خدمات کو سراہتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی ترغیب اس وقت دی جب کہ برصغیر کے اکثر علماء انگریزی پڑھنے پڑھانے کو گناہ خیال کرتے تھے۔ یہی نہیں مولانا نے دیسی مصنوعات، پارچہ جات کو بدیسی ملبوسات اور ساز و سامان پر اس وقت ترجیح دی جب کہ مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی جی نے ترک موالات یا بدیسی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع نہ کی تھی۔ اور مولانا نے مسلمانوں کے لئے ایک صنعتی اور ٹیکنیکل ادارے کی ضرورت اس وقت محسوس کی جب کہ برصغیر کے تعلیمی مفکرین نے گاندھی آشرم اور بیسک ایجوکیشن کے منصوبے کا خواب نہ دیکھا تھا۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ مولانا اپنی کم آمیزی اور خود پوشی کی وجہ سے اپنے دور کے مصلحین کی سی شہرت نہ پا سکے، ورنہ اپنے دائرے میں رہ کر انھوں نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ انیسویں صدی کے دوسرے مذہبی و تعلیمی مصلحین کے کارناموں سے کم اہم نہیں ہے۔ عوام نہ سہی برصغیر کے خواص ان سے خوب واقف ہیں اور ان کی ملی و قومی خدمات کے معترف ہیں۔ تبھی تو علامہ شبلی کہتے ہیں کہ "مولانا ظہور الاسلام فتحپوری کو کون نہیں جانتا۔ ندوۃ العلماء کے قیام میں سب سے زیادہ انہیں کا حصہ ہے"[1] علامہ شبلی کے نامور شاگرد اور جانشین علامہ سید سلیمان ندوی ایک جگہ مولانا حسرت پر تبصرہ کرتے ہوئے فتحپور کے ذکر میں لکھتے ہیں: "مولانا ظہور الاسلام ایک متقی و پرہیزگار و باصفات بزرگ تھے۔ حضرت قطب الوقت مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ندوۃ العلماء کے ارکان خاص میں تھے اس لئے خاکسار کو بار بار ان کی زیارت کا موقع ملتا تھا۔ بلکہ میرے بچپن میں وہ مولانا محمد علی مونگیری کے ساتھ خاکسار کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ بھی تشریف لائے تھے تو پہلے وہیں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی کو انہیں پاک سیرت و پاک نہاد و پاک باز بزرگ کی صحبت نصیب ہوئی"[2]

لیکن بات صرف یہیں تک نہیں ہے کہ مولانا ندوۃ العلماء کے ارکانِ خاص میں تھے۔ بلکہ ان کے بعض ہم عصر مورخین و محققین نے یہ راز بھی فاش کر دیا ہے کہ جس شخص کے ذہن میں سب سے پہلے ندوہ کے قیام کا خیال آیا وہ سید شاہ ظہور الاسلام تھے۔ چنانچہ برصغیر کے ایک معروف مورخ اور الہلال کے مصنف مولانا عبدالرزاق کانپوری جنھوں نے علامہ شبلی اور مولانا دونوں کی صحبتوں سے فیض اٹھایا ہے اور جو ندوہ کی تحریک میں بذاتِ خود شروع سے شریک تھے لکھتے ہیں کہ "روئیداد ندوۃ العلماء" میں ہنوز یہ نہیں لکھا گیا کہ اسلامی انجمن کا بانی کون ہے اور یہ خیال کس کے دماغ کا مرہون منت ہے اس لئے اس کی مختصر تاریخ لکھتا ہوں کہ صفحات تاریخ میں درج رہے"۔ اس کے بعد مولانا

---

[1] یادگار ظہور از مولانا حسن الدین خاموش مطبوعہ عزیزیہ پریس آگرہ ۱۹۲۱ء۔ [2] معارف، دسمبر ۱۹۵۱ء

عبدالرزاق لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں بمقام علیگڑھ کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۹۱ء میں مجھے فتح پور جانے کا اتفاق ہوا اور جناب استاذی حکیم مولوی ظہور الاسلام صاحب سے علیگڑھ کا ذکر آیا تو فرمایا کہ میں آج ہی صبح کو ڈپٹی عبدالغفور سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ بہتر ہوگا کہ اس معاملے میں ڈپٹی صاحب سے دوبارہ گفتگو کی جائے آؤ تم بھی میرے ہمراہ چلو۔ چنانچہ بعد نماز عصر ڈپٹی صاحب سے گفتگو ہوئی کہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور قدیم مشرقی تعلیم کی اشاعت و تحفظ اسلام کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے اور مشاہیر علمائے ہند کے مشورے سے بمقام کانپور یہ انجمن قائم ہو۔ اگر فی الحال کانفرنس اپنے سالانہ جلسوں کے ساتھ اس انجمن کا انعقاد بھی کیا کرے تو مناسب ہوگا۔ لہذا ہونے والی کانفرنس میں ایک ریزولیشن پیش کیا۔ چونکہ ریزولیشن کو انگریزی تعلیم سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ مذہبی اور مشرقی تعلیم پر زور دیا گیا تھا لہذا کمیٹی نے ریزولیشن کو نامنظور کر دیا۔ . . . . . جنوری ۱۸۹۲ء میں علیگڑھ سے واپسی پر مولانا کی خدمت میں خاکسار نے واقعات عرض کئے۔ فرمایا کچھ مضائقہ نہیں، اب دوسری کارروائی کی جائے گی۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کے مکان پر جو کانپور میں تعینات تھے از سر نو مشورہ ہوا اور حسب ذیل علماء کی کمیٹی مشورہ کے لئے مقرر کی گئی۔

۱۔ مولانا سید محمد علی کانپوری (۲) مولانا محمد اشرف علی تھانوی (۳) مولانا فخر الحسن گنگوہی۔ (۴) مولانا نور محمد مدرس اول مدرسۂ اسلامیہ فتح پور (۵) مولانا احمد حسن (۶) مولانا ظہور الاسلام فتحپوری (۷) منشی عبدالغفور فتح پوری اور (۸) خاکسار راقم الحروف۔ چنانچہ اس کمیٹی کے ماہانہ جلسے کانپور میں مسلسل ہوتے رہے اور جب ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کانپور میں ہوا تو کمیٹی مذکور کی تجاویز سے ارکان نے بہت نفع اٹھایا۔ یہ تھی ندوہ کی مختصر تاریخ۔[1] مولانا عبدالرزاق کے اس واضح بیان سے یہ بات مبہم نہیں رہ جاتی کہ ندوۃ العلماء کے قیام کا خیال دراصل سب سے پہلے مولانا سید ظہور الاسلام کے ذہن میں آیا تھا۔

---

[1] یاد ایام صفحہ ۱۰۴ از مولانا عبدالرزاق کانپوری۔

ان بیانات سے مولانا کی شخصیت و کمالات کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا۔

ان کا گھرانہ پچھلی کئی پشتوں سے مسلمانوں کی روحانی اور دینی رہنمائی کر رہا تھا۔ ان کے والد میر حسن علی سالکان باخبر میں تھے، اور مولانا شاہ ابوالقاسم مسویؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ شاہ میر حسن کی شادی رائے بریلی کے مشہور عالم سید اولاد حسن کی بیٹی سے ہوئی جن کے بطن سے ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں مولانا سید ظہور الاسلام پیدا ہوئے۔ بچپن رائے بریلی میں گزرا اور ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ بعد ازاں حصول تعلیم کی غرض سے کانپور، علیگڑھ اور لکھنؤ بھیجے گئے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا لطف اللہ جیسے دینی رہنماؤں اور عالموں کے ہاتھوں مولانا کی تعلیم مکمل ہوئی اور بیس سال کی عمر میں مولانا فارغ التحصیل ہو گئے۔ کچھ دنوں کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ سے منسلک رہے۔ پھر اپنے پیر و مرشد مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے اشارے پر اپنے وطن فتح پور واپس آگئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

ابھی مولانا کی عمر مشکل سے ۲۵ یا ۲۶ سال تھی کہ انہوں نے فتحپور میں ایک مدرسۂ اسلامیہ کی بنا ڈالی جو ان دنوں مسلم انٹر کالج کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا کا حسن اخلاق و حسن عمل اور طرز تدریس کی ایسی شہرت ہوئی کہ مدرسہ میں دور دراز علاقوں مثلاً بہار، بنگال اور پنجاب وغیرہ سے طلبا آنے لگے۔ یہ بھی مولانا کا حسنِ انتظام اور ان کی ذات و صفات کا اثر تھا کہ مدرسے کو مولانا نور محمد اور مولوی امام علی جیسے نامور علما، معلم کی حیثیت سے نصیب ہوئے۔ اس مدرسہ سے بے شمار طلبا، علوم دینی و دنیوی میں فارغ التحصیل ہو کر نکل چکے ہیں اور بر صغیر کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض نہایت ممتاز اور اہم منصبوں پر فائز ہیں۔ لیکن مولانا کے فیض یافتہ حضرات میں جن صاحبان نے دنیائے علم و ادب میں خاص طور پر شہرت حاصل کی ان میں مولانا عبدالرزاق کانپوری، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحیٰ اور نیاز فتحپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبدالرزاق اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میری ابتدائی تعلیم فتح پور میں ہوئی۔ منشی میر امام علی سے دس سال میں فارسی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد مولانا سے عربی شروع کی قطبی ختم کر کے مدرسہ فیضِ عام میں داخل ہوا[1]۔ مولانا

---

[1] یاد ایام ص ۱۰۲ مطبوعہ عبدالحق اکیڈمی۔

حسرت موہانی کی عربی فارسی کی تکمیل بھی مولانا کے ہاتھوں ہوئی۔ مولانا کی شخصیت و صحبت کا ان پر گہرا اثر پڑا اور سچ پوچھو تو یہ مولانا ظہور الاسلام ہی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ حسرت بہت جلد سید فیض الحسن سے مولانا حسرت موہانی ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی نے اکثر جگہ مولانا ظہور الاسلام کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "دو فارسی غزلیں بھی قیام فتح پور کے زمانہ کی یادگار ہیں جب کہ استاذی مولانا ظہور الاسلام مرحوم نیز حضرت نیاز فتحپوری کے والد ماجد کے فیض قرب نے نظم و نثر کی مشق کا ایک خاص شوق پیدا کر دیا تھا۔

وہ صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں[1]

مولانا نیاز فتحپوری اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے ذکر میں ایک جگہ لکھتے ہیں "آپ لوگ یوں سمجھ لیجئے کہ میری عمر کا بارھواں سال ہے (۱۸۹۹ء) اور میں اپنے وطن فتح پور میں مدرسۂ اسلامی میں تعلیم کی غرض سے آتا جاتا ہوں جسے مولانا ظہور الاسلام نے قائم کیا تھا۔ میں یہاں ایک ہی وقت میں عربی بھی پڑھتا تھا اور انگریزی شاخ میں انگریزی بھی۔ مولانا ظہور الاسلام بڑے رفیق القلب انسان تھے۔ وہ فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اور ان کے ادبی رجحان نے ان میں زاہدانہ احتساب اور عابدانہ دار و گیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو و درگذر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں نماز کا پابند تھا مگر اتنا زیادہ نہیں تاہم مجھے خوب یاد ہے کہ جب مولانا ظہور الاسلام کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو ذہن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی۔ ان کے لہجے کی نرمی و رقت اور اس کے سخن کا میرے دل پر بہت اثر پڑتا[2]۔ نامور شاگردوں کے ان بیانات سے استاد کی شخصیت و عظمت کا کم و بیش اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یوں تو مولانا کے ہر قول و فعل میں کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو پوشیدہ ہوتا تھا اور وہ زندگی بھر

---

[1] دیوان حسرت ہفتم مرتبہ بیگم حسرت موہانی۔ [2] نگار اگست ۱۹۶۱ء

مسلمانوں کو اخلاقی و معاشرتی اور ذہنی پستی سے نکالنے کی کوشش فرماتے رہے لیکن مولانا کو درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ تعلیم کے متعلق نہایت واضح اور وسیع نقطۂ نظر رکھتے تھے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے انہیں خاص طور پر دلچسپی تھی اور وہ تعلیم کو قوم و ملک کی ترقی کا بنیادی عنصر خیال کرتے تھے۔ جب کوئی شخص زندگی کی بے ثباتی اور دنیا کی ناپائیداری کا ذکر کرکے ان کی توجہ ان کے تعلیمی نصب العین سے ہٹانا چاہتا تو مولانا فرماتے کہ " قوم تعلیم کی ضرورت سے کبھی مستغنی نہ ہوگی خواہ قیامت کل آجائے۔"[۱] غرضیکہ تعلیم کو عام کرنے اور مسلمانوں کو سارے مغربی و مشرقی علوم مروجہ سے بہرہ ور کرنے کی انہیں خاص دھن تھی۔ اسی دھن میں انہوں نے مدرسۂ اسلامیہ فتحپور کی بنیاد ڈالی اور عربی و انگریزی کے ساتھ فنی تعلیم کا بھی انتظام کیا چنانچہ جب ندوہ یا مدرسۂ اسلامیہ کا ذکر آتا تو فرماتے کہ جس طرح سید احمد نے اپنے کالج میں دین کا دانہ ڈال کر دنیا کے جال میں پھنسایا تھا۔ اسی طرح میں اپنے مدرسہ میں دنیا کا دانہ ڈال کر دین کے پھندوں میں پھنسانا چاہتا ہوں۔[۲] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا برصغیر کے مسلمانوں کے تعلیمی مسئلے کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے تھے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ انگریزی پڑھنے پڑھانے کے قائل اور سرسید کی تعلیمی تحریک کے حامیوں میں تھے۔ سرسید کی طرح مولانا کے پیشِ نظر بھی مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دائیں ہاتھ میں فلسفہ، بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللہِ کا تاج ہو۔ لیکن سرسید کی ساری توجہ چونکہ دنیاوی اور مغربی تعلیم پر مرکوز تھی اس لئے مولانا مدرسۂ علیگڑھ سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ انہیں علیگڑھ کی وہ سیاسی و تعلیمی روش پسند نہ تھی جو وہاں کے اکثر طلباء کو مشرق سے خواہ مخواہ متنفر و منحرف اور مغرب کا دلدادہ بنا رہی تھی۔ غالباً علی گڑھ کی یہی وہ ناپسندیدہ روش تھی جس نے خود سرسید کے فیض یافتہ اور علیگڑھ کے تعلیم یافتہ اشخاص مثلاً علامہ شبلی، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کو علیگڑھ کے باغی بننے پر مجبور کر دیا۔ لیکن علی گڑھ

۱ھ - یادگارِ ظہور ص ۱۵ - ۲ھ - یادگارِ ظہور ص ۱۰ -

اور سرسید سے بعض اختلاف رکھنے کے باوجود مولانا نے سرسید یا علیگڑھ کو کبھی برا بھلا کہنا یا گالی دینا پسند نہیں کیا۔ وہ علیگڑھ کی کمزوریوں کے باوجود اس کی تعلیمی خدمات کے معترف تھے۔ اسی لئے جب علی گڑھ کے متعلق کوئی اچھی خبر سنتے تو بہت خوش ہوتے اور جب کوئی بری خبر سنتے تو ملول ہوجاتے جب کوئی شخص سرسید یا علی گڑھ کو برا بھلا کہتا تو فرماتے کہ " اللہ میاں کا نام غفور الرحیم ہے۔ کون جانتا ہے کہ سرسید کا خلوص اس کے کام آگیا اور غلطیوں اور لغزشوں کا دفتر اس کے ان آنسوؤں کی چند بوندوں نے دھو دیا جو کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے امت کی خستہ حالی بیان کرتے ہوئے نکل پڑے تھے[۱]۔ چنانچہ جب لوگ مولانا کے سامنے دیوبند اور علی گڑھ کا ذکر چھیڑتے اور ایک دوسرے کی مخالفت میں لعن وطعن پر اتر آتے تو مولانا نہایت رنجیدہ ہوتے اور اپنے تعلیمی نقطہ نظر کی وضاحت یوں کرتے کہ " کالج اور مدرسہ میری تو دونوں آنکھیں ہیں اور میں ان میں سے کسی کو پھوٹنے پر تیار نہیں ہوں "

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے مسلمان جس اقتصادی وسیاسی بدحالی کا شکار ہوئے اس کے اور بھی کئی سبب تھے۔ لیکن مولانا کے نزدیک اس زوال و افلاس کا اصل سبب تعلیم کی کمی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ صرف تعلیم کی کمی کے سبب مسلمان ایسی مذہبی تنگ نظری اور تقلیدی رجحان کا شکار ہوئے جس نے ان سے شعور حیات چھین لیا۔ اور جس نے انہیں دین و دنیا کے باہمی تعلق کو سمجھنے اور اس سے نفع اٹھانے سے قاصر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا زندگی کے سارے مسائل میں تعلیمی مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور رنگ و نسل و مذہب سے بالاتر رہ کر ہر قسم کی تعلیم کے حصول کو قومی و ملی ترقی کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ " مجھے انگریزی یا کسی زبان سے تعصب نہیں ہے بشرطیکہ وہ اپنے مذہب سے واقف ہو " یہی سبب ہے کہ مولانا ہر زبان اور ہر مضمون کے طالب علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے خود بھی شب و روز درس و تدریس میں لگے رہتے اور دوسروں کو بھی راہ پر لگانے کی کوشش کرتے۔ کہا کرتے

---

[۱] یادگار ظہور ص۵۱۔ مولانا کے اکثر اقوال جو اس مضمون میں واوین کے اندر آئے ہیں وہ یادگار ظہور از مولانا محسن الدین خاموش اور استاذی مولانا عبیدالوحید استاد فارسی مسلم انٹر کالج کے ان مضامین سے ماخوذ ہیں جو کالج کے مجلہ ارمغان میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں۔

کہ "پڑھانے سے میرا جی بہلتا ہے جو کوئی مجھ سے پڑھتا ہے میں اس کا شکر گزار ہوں۔ کیونکہ اس سے میری تفریح کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔" اکثر یہ بھی فرماتے کہ جب میں کسی لڑکے کے بغل میں کتاب دیکھتا ہوں تو میری روح تازہ ہو جاتی ہے۔ اور بے اختیار اسے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خواہ وہ کسی قوم کا بچہ ہو۔"

مولانا کے اسی پیار و محبت کا نتیجہ تھا کہ ان کے حلقۂ شاگردی میں مسلمان اور ہندو دونوں برابر کے شریک تھے۔ فتح پور میں کائستھوں کا وہ خاندان جو موٹی اینٹ والوں کے نام سے مشہور ہے اور جو اپنے علم و فضل اور دولت و منصب کے اعتبار سے بھی نہایت ممتاز خیال کیا جاتا ہے، مولانا ہی کی درسی مجلسوں کا فیض یافتہ ہے بلکہ مولانا کے اولین شاگردوں میں اسی خاندان کے بعض افراد ہیں مثلاً لالہ ایشور سہائے اور ان کے تین حقیقی بھائی میجر رنجیت سنگھ، رام چندر مان سنگھ، اور رائے بہادر مان سنگھ جو عہد برطانوی کے پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں آئی۔ سی۔ ایس۔ پی کا عہدہ دیا گیا۔ لالہ ایشور سہائے مولانا کے خاص شاگردوں اور معتقدوں میں تھے اور ان کے سارے بچوں نے جو کہ بعد کو نہایت اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے، عربی و فارسی کی تکمیل مولانا ہی سے کی ہے۔ غرض مولانا

لہ۔ لالہ ایشور سہائے کے چھ لڑکے ہیں (۱) کیشن مان سنگھ (۲) بہادر مان سنگھ (۳) دلیپ مان سنگھ (۴) نر ایشور مان سنگھ (۵) امر مان سنگھ (۶) سر ایشور مان سنگھ۔ یہ سب عربی فارسی اور علوم مذہبی میں خاص دستگاہ رکھتے ہیں اور مولانا ظہور الاسلام کے معتقدوں میں ہیں۔ بہادر مان سنگھ اور امر مان سنگھ اردو کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری کے بہنوئی ہیں۔ دلیپ مان سنگھ نے ۲۳-۱۹۲۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا امرناتھ اور علی اکبر ان کے ہم جماعت تھے۔ مولانا ظہور الاسلام اپنے زمانۂ علالت میں ایشور سہائے کے اصرار پر انہیں کے یہاں مقیم تھے، چنانچہ مولانا کا وصال انہیں کی کوٹھی میں ہوا۔ لالہ ایشور سہائے اور ان کے خاندان کے افراد اپنے لئے سعادت سمجھ کر مسلمانوں کی عام اجازت سے مولانا کا جنازہ اپنے کندھوں پر مزار تک لے گئے۔ مولانا کے بعض ملبوسات ملفوظات اور خطوط بطور تبرک اس خاندان میں محفوظ ہیں۔ دلیپ مان سنگھ نے جو ۱۹۱۲ء سے مسلسل اپنی ڈائری فارسی اور انگریزی میں لکھ رہے ہیں، مولانا کے بہت واقعات اپنی ڈائری میں محفوظ کر دیئے ہیں اور مجھے اپنے مضمون کے لئے زیادہ مواد انہیں سے ملا ہے۔

کو تدریس سے فطری لگاؤ تھا اور وہ ہر مذہب و ہر قوم کے بچے کو تعلیم کی طرف رجوع دیکھکر بہت خوش ہوتے تھے۔ خواہ یہ تعلیم کسی بھی زبان اور کسی بھی مضمون کی ہو۔ ایک مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی کا ایک مسلمان طالب علم جو سنسکرت میں ایم اے کر رہا تھا۔ مولانا کی شہرت سن کر زیارت کے لئے آیا۔ مولانا اس سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اس کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔ لڑکے نے کہا آپ مجھے پہلے مولوی ملے ہیں جو اس سلسلہ میں میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں ورنہ عام طور پر لوگ مجھ پر لعنت و ملامت کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا "علم کسی قسم کا ہو مفید ہے بشرطیکہ اس کی تحصیل کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود ہو"

غرض یہ کہ مولانا تعلیم کا نہایت وسیع نقطہ نظر رکھتے تھے اور دنیا و دین کی ترقی کے لئے مختلف علوم و فنون کی تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام دین و دنیا کا مجموعہ مرکب ہے۔ مجموعہ کا ایک جزو بھی نکال ڈالا جائے تو پھر کچھ نہیں رہتا۔ غالباً اسی لئے انہوں نے انگریزی تعلیم کے حصول اور فنی تعلیم کی اشاعت کو اس وقت ضروری خیال کیا جب کہ ان کے اکثر معاصر اس قسم کی تعلیم کو گمراہی پر محمول کرتے تھے چنانچہ مدرسۂ اسلامیہ کے قیام اور اس میں انگریزی تعلیم کی بڑی مخالفتیں ہوئیں لیکن وہ اپنی دھن میں لگے رہے اور مدرسہ کو انٹرنس کے درجہ تک پہنچا کر دم لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی بڑی خواہش یہ بھی تھی کہ ان کے مدرسہ کا ہر انٹرنس پاس طالب علم دینی علوم اور عربی فارسی سے بھی واقف ہو۔ نئے علوم کی طرف مولانا کا انہماک دیکھ کر بعض علماء اور احباب اکثر ان سے بحث مباحثے میں الجھنا چاہتے لیکن چونکہ مولانا عملی آدمی تھے اور محض تقریری مباحثہ کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے اس لئے جہاں بات الجھتی وہ جلد گفتگو ختم کرنے کی کوشش میں صاف کہہ دیتے کہ "چاہے کوئی مجھے کچھ سمجھے مگر میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ دنیا جس کی درست نہیں اس کا دین بھی خطرے میں ہے۔ اس لئے میری توجہ مسلمانوں کی دنیاوی اصلاح کی طرف زیادہ رہتی ہے" چنانچہ وہ اسی نقطہ نظر کے پیش نظر مسلمانوں کو دینی و دنیاوی دونوں علوم کی طرف برابر اکساتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مسلمان سارے مروجہ علوم و فنون سے گہری دلچسپی

کا اظہار نہ کریں گے اور زمانے کے ساتھ دوڑنے کی کوشش نہ کریں گے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے مولانا کہا کرتے تھے کہ "تعلیم ایک زمین ہے جس کے بغیر ہم بیج نہیں بو سکتے۔ اس لئے ہم میں سے ایک خاص جماعت کو اشاعت تعلیم میں ہمہ تن مصروف رہنا چاہیئے۔

مسلمانوں کی کسی خاص جماعت نے مولانا کی تجویز پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن مولانا نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہر چند کہ مدرسے کا نظم و نسق ایک مجلس انتظامیہ کے سپرد تھا لیکن مولانا مدرسے کے مشاغل سے ایک آن بھی غافل نہ رہتے تھے۔ سوتے جاگتے اور سفر و حضر ہر وقت مولانا کو مدرسے کا خیال رہتا۔ جس جانفشانی اور جد و جہد سے سرسید احمد خاں نے مدرسۂ علیگڑھ کو پروان چڑھایا تھا اسی طرح مولانا جب تک حیات رہے اپنے خون جگر سے مدرسے کو سینچتے رہے انہیں مدرسہ کی کس درجہ فکر تھی اس کا اندازہ ان کے بعض واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کے مکان کا دروازہ پرانا ہونے کی وجہ سے نکل گیا تھا کتے اکثر گھر میں داخل ہو جاتے اور ساری چیزیں اکثر خراب کر دیتے۔ مولانا کی اہلیہ سخت پریشان رہتیں اور کبھی کبھی مولانا کی توجہ دروازے کی طرف مبذول کراتیں۔ لیکن مولانا کو چونکہ گھر سے زیادہ مدرسہ کی فکر رہتی تھی اس لئے جو دروازہ گھر میں لگانے کے لئے آتا۔ وہ دوسرے دن مدرسہ میں لگوانے کے لئے منگوا لیا جاتا۔ اس طرح بہت دنوں تک مولانا کا گھر بے دروازہ رہا۔ آخر کار ایک عزیز نے زبردستی دروازے کو درست کرا دیا۔ مولانا چونکہ حافظ، حکیم، حاجی، معلم، عالم، صوفی اور روحانی بزرگ بھی کچھ تھے اس لئے چھوٹے بڑے ہندو مسلمان سینکڑوں آدمی روزان سے ملنے کے لئے آتے اور اپنے ساتھ ساتھ تحفے تحائف اور نقدی بھی لاتے لیکن مولانا نے اپنی اہلیہ کی تربیت کچھ اس طور پر کی تھی وہ خود بھی مدرسہ کو ترجیح دینے لگی تھیں۔ چنانچہ مولانا ساری چیزیں اہلیہ سے مانگ کر مدرسے کے حوالے کر دیتے تھے۔ البتہ رسہائے اور ان کے خاندان کے افراد مولانا کو اکثر قیمتی لباس بنوا دیتے۔ مولانا ان کا دل خوش کرنے کے لئے ایک دو دن پہن لیتے پھر یا کسی حاجت مند کے حوالے کر دیتے یا فروخت کر کے مدرسہ میں لگا دیتے۔ مولانا جب پٹنہ تشریف لے گئے تھے تو ان کے پیر بھائی مولانا محمد علی

مونگیری نے انہیں ایک قیمتی حقہ بطور تحفہ دیا۔ مولانا نے الٰہ آباد پہنچ کر حقہ فروخت کر دیا اور قیمت مدرسہ میں لگا دی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مولانا کے بعض مخلصین نے مولانا کے بیوی بچوں کے نام غیر منقولہ جائیدادیں اور زمینیں منتقل کر دیں تاکہ اس کی آمدنی سے بچے کچھ راحت اٹھائیں لیکن مولانا نے وہ بھی مدرسہ کے نام وقف کر دیں۔ غرض مولانا نے اپنا جان و مال سب مدرسہ کے سپرد کر رکھا تھا۔ مدرسہ کے سارے چھوٹے بڑے کاموں کو خود دیکھتے اور ضروریات کو پوری کرنے کی کوشش کرتے خواہ اس میں انہیں کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔ مدرسے کے بورڈنگ ہاؤس میں جو طلبا رہتے تھے مولانا انکی ضرورتوں کا بالخصوص لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے لباس، خوراک اور آرام کا انتظام کرتے اگر کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو حکیم کی حیثیت سے خود اس کا علاج کرتے۔ روز عیادت کو جاتے اور ہر طرح کا اطمینان دلاتے بعض واقعات سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا مدرسہ کے طالب علموں کے آرام و آسائش کا خیال اپنے بچوں سے بھی زیادہ رکھتے تھے اور طلبا کی خاطر اپنے بچوں اور اپنے جان و مال کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کے جذبۂ ایثار و قربانی کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک بار فتح پور میں ہیضہ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی روز سینکڑوں موتیں واقع ہوتیں اور تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ ایک دن اچانک بورڈنگ ہاؤس سے خبر آئی کہ بنگال کا ایک طالب علم ہیضہ میں مبتلا ہو گیا ہے مولانا بے قرار ہو گئے دوڑے ہوئے مدرسہ پہونچے اور طالب علم کو اپنے گھر اٹھا لائے۔ لڑکے کوتے ہوتی مولانا اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے دست آتے تو بول و براز اٹھاتے اور اس کے کپڑے دھوتے۔ دوا پر دوا دیتے اور دعا فرماتے کہ اللہ غریب پردیسی پر رحم کرے اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہے لیکن بیمار کی حالت سدھرنے کی بجائے گرتی جاتی اور مولانا کی پریشانی بڑھتی جاتی اسی حالت میں آدھی رات ہو گئی سب تیمار دار جاکر سو رہے لیکن مولانا کی آنکھ نہیں لگی۔ رات بھر اس کی دیکھ بھال میں لگے رہے۔ رات ڈھلے جب یکایک بعض لوگوں کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھا کہ مولانا بیمار کے قریب جائے نماز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں اور آہستہ آہستہ فرما رہے ہیں" مالک ہو جو چاہو سو کرو۔ قادر مطلق ہو جو چاہو کر ڈالو۔ قانون قدرت تمہارا بنایا ہوا ہے اس

کو چاہو توڑ سکتے ہو۔ آخر مجھے سرخرو کرو۔ بچہ پردیسی ہے میرے بھروسے آیا تھا۔ ماں باپ کا کیا حال ہوگا اگر یوں مجھ گنہگار کی دعائیں قبول نہیں کرتے تو میری نذر قبول کرو۔ جان کے بدلے جان حاضر ہے میرا بچہ اس کے عوض میں حاضر ہے قبول فرمایئے۔ وہ بھی آپ کا اور میں بھی آپ کا۔" یہ دعا کس قدر معصوم، کس قدر پرخلوص، کس درجہ درد انگیز اور کس درجہ محبت سے لبریز تھی۔ اثر کیوں نہ ہوتا۔ دعا قبول ہوئی چنانچہ ابھی صبح بھی نہ ہوئی تھی کہ اچانک اندر سے اطلاع آئی کہ مولانا کے اکلوتے نوجوان بیٹے عتیق اللہ کو قے ہو رہی ہے۔ ہیضے کا شدید حملہ ہو چکا ہے۔ مولانا اندر گئے۔ بیٹے کی نبض دیکھی دوا پلائی۔ فائدہ نہ ہوا لیکن جیسے جیسے بیٹے کی حالت بگڑتی جاتی بنگالی طالب علم کو افاقہ ہوتا جاتا آخر کار اسی دن بنگالی طالب علم صحت یاب ہو گیا اور عتیق اللہ، اللہ کے پیارے ہو گئے۔ اب اسے مولانا کے جذبۂ ایثار کا کا نام دیجئے یا تصرف روحانی کہہ لیجئے۔ اس لئے کہ مولانا صبر و شکر کے سوا اس سانحۂ عظیم پر حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور نہایت ضبط و استقلال کے ساتھ لخت جگر کو سپرد خاک کر دیا۔ یہ تھا وہ جذبۂ ایثار و عمل جس کے ماتحت مولانا نے مدرسہ کو پروان چڑھایا اور تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے کی جدوجہد فرمائی۔ یوں وہ مدرسہ کے بانی، صدر سبھی کچھ تھے لیکن کام کے لئے وہ مدرسے کے سپاہی بنے رہتے تھے۔ کسی نے ان کے متعلق بہت صحیح کہا تھا کہ:

خود صدر، خود سپاہی، خود مدرسے کا بانی

پھر احتیاط ایسی دانہ چھوا نہ پانی

مولانا اگرچہ روحانی بزرگوں اور برگزیدہ صوفیوں میں تھے لیکن انہوں نے نہ تو کبھی گوشہ نشینی اختیار کی اور نہ کسی منزل میں کبھی دینی یا دنیاوی فرض کا ترک گوارا کیا۔ وہ شریعت کے سختی سے پابند اور مذہب و اعتقادات میں راسخ تھے۔ زہد و تقویٰ، ریاضت و عبادت اور اتباع سنت کا انہماک اس درجہ پر پہنچا ہوا تھا کہ دیکھنے والے حیرت میں رہتے تھے۔ نماز پنجگانہ ہمیشہ مسجد میں باجماعت ادا کرتے اور دوسروں کو بھی تلقین فرماتے تھے۔ لیکن مذہبی شغف اور متصوفانہ ذکر و فکر کے باوجود مولانا میں مذہبی تنگ نظری یا تعصب نام کو بھی نہ تھا۔ ان کا اصل مسلک انسان

دوستی تھا اور وہ انسان کی تالیف قلب کو عبادت سے الگ خیال نہ کرتے تھے چنانچہ مولانا کو ریاضت و عبادت کے بعد جو وقت ملتا تھا وہ سارا کا سارا حق العباد اور خدمتِ خلق میں صرف کرتے تھے۔ معلم کی حیثیت سے وہ چھوٹے بڑے عورت مرد ہندو مسلمان سب کو تعلیم دیتے تھے اور بلا معاوضہ تعلیم دیتے تھے۔ شہر میں کوئی بچہ گھومتا پھرتا نظر آتا تو اسے سمجھا کر مدرسہ میں داخل کرتے۔ طبیب کی حیثیت سے بیماروں کا مفت علاج کرتے اور مریضوں کی عیادت کو جاتے۔ صبح کی نماز کے بعد جب مولانا چند گھنٹوں کے لئے اپنی نشست گاہ پر ٹھہرتے تو وہ وقت اہل بصیرت کے لئے دیکھنے کے قابل ہوتا ایک طرف مریضوں کا ہجوم ہے مولانا کا ایک ہاتھ کسی کی نبض پر ہے۔ دوسرا اپنی طرف مخاطب کر رہا ہے کہ حضور میری لڑکی جوان ہے اس کی فکر کیجئے نہ پیسہ ہے نہ بر کا پتہ۔ تیسرا کہہ رہا ہے کہ میں بے روزگاری سے پریشان ہوں کہیں مجھے روزگار دلوا دیجئے۔ فلاں سے سفارش کر دیجئے۔ چوتھا عذر لگا رہا ہے کہ میرے لڑکے کے وظیفہ کا بندوبست کروائیے وہ اب بغیر وظیفہ کے پڑھ نہیں سکتا۔ اسی طرح کی دوسری خواہشیں لے کر ضرورت مند جمع رہتے۔ مولانا ہر ایک آواز پر لبیک کہتے انہیں اطمینان دلاتے اور ہر ایک کی حاجت روائی کی پوری کوشش فرماتے۔

خوش خلقی اور سادہ مزاجی کے ساتھ ساتھ صلح جوئی کا یہ حال تھا کہ اگر مولانا کو دو بھائیوں کی باہمی نزاع کی خبر ہو جاتی تو جب تک ان دونوں میں صلح صفائی نہ کرا دیتے چین سے نہ بیٹھتے اسی طرح جب تک وہ مسلمان جوان بیوگان کا بر تلاش نہ کر لیتے اطمینان نصیب نہ ہوتا۔ ان کی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس علاقے میں بیوگان کو آسانی سے بر ملنے لگا اور جس چیز کو مسلمان اپنی جہالت و تنگ نظری سے معیوب خیال کرنے لگے تھے وہ مستحسن خیال کی جانے لگی۔ غرض مولانا کا کوئی قول یا عمل انسانوں کی عام فلاح و بہبود خصوصاً مسلمانوں کی سماجی و معاشرتی اصلاح سے خالی نہ ہوتا۔ مولانا کے ایک ہندو معتقد کیپٹن دلیپ مان سنگھ جن کا ذکر پچھلے صفحات کے حاشیہ میں آچکا ہے مولانا کے وصال سے صرف دو ماہ پہلے کا ایک واقعہ اس طرح لکھتے ہیں کہ شام کو مولوی صاحب سے ملنے گیا۔ مولوی صاحب مجھے تنہائی میں لے گئے اور فرمایا کہ تمہارے والدین نے تمہاری شادی جس لڑکی سے

طے کی تھی اس سے انکار کر کے تم اپنے والدین کا دل مت دکھاؤ۔ میں نے مولوی صاحب سے صاف کہہ دیا کہ میں والدین کی فرمانبرداری سے منہ نہیں موڑنا چاہتا لیکن جس لڑکی سے انہوں نے میری نسبت طے کی ہے وہ یکسر غیر تعلیم یافتہ ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا جب میری شادی ہوئی تھی تو میری اہلیہ بالکل ناخواندہ تھیں لیکن میں نے اپنے والدین کا حکم مانا اور اس طور پر ان کی تعلیم و تربیت کی آج میری اہلیہ مسلمان طبقے کی نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون خیال کی جاتی ہیں لوگوں نے ہمیشہ بیوی بچوں پر والدین کو ترجیح دی ہے اس لئے تمہارے لئے بھی ضروری ہے کہ والدین کو ناخوش نہ کرو۔ میں نے مولوی صاحب سے وعدہ کیا کہ میں اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔ گھر واپس آکر میں نے سارا واقعہ اپنی والدہ سے بتایا اور ان سے گستاخی کی معافی چاہی میری والدہ بہت خوش ہوئیں[1] اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے اصلاحی طرز نے کیسے کیسے مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

مولانا طبعاً کچھ ایسے شگفتہ مزاج خلیق و بامروت واقع ہوئے تھے کہ جو شخص ایک دفعہ بھی ان سے ملنے آتا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو جاتا۔ نتیجتہً مولانا کے پاس ملنے جلنے والوں کا ایک ہجوم لگا رہتا۔ لیکن مولانا کبھی کسی کو نظر انداز نہ کرتے ہر شخص کے سوال کا خواہ وہ کتنے ہی بے محل اور غیر ضروری کیوں نہ ہو، مولانا نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتے اور اسے مطمئن فرماتے پھر یہ کمال تھا کہ مولانا کی کوئی گفتگو یا کوئی جواب اصلاحی پہلوؤں سے خالی نہ ہوتا۔ باتوں باتوں میں بڑے کارآمد درس دے جاتے۔ ایک دفعہ کسی صاحب نے پوچھا کہ مولانا جب کسی نیک تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیتا ہوں تو لوگ مجھے خبطی کہنے لگتے ہیں اور میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سوچتا ہوں ایسے ناقدوں کے لئے کچھ کروں فرمایا: تمہیں خوش ہونا چاہیئے کیونکہ تکمیل ایمان کی ایک بڑی شرط یہ ہے کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں۔ خدا یہ درجہ سب کو دے۔ یہی تو سنتا ہوں کہ لوگ مجھے خبطی کہتے ہیں تو میں خدا کا شکر

۱۔ ڈائری کیپٹن دلیپ مان سنگھ مرقومہ ۲ر جنوری ۱۹۲۱ء۔

ادا کرتا ہوں۔ مولانا کے اس جواب سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عقاید و نظریات میں کس قدر پختہ تھے۔

اسی طرح کے مختلف سوالات کرنے والوں میں سے ایک شخص نے پوچھا "مولانا یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف تو مسلمان اپنے جمع شدہ مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ بھی دیں دوسری طرف یہ کہ اپنی رقم پر سود بھی نہ لیں۔ اس صورت میں یہ قوم مالدار کیسے بن سکتی ہے۔ مولانا نے جواب دیا ہاں یہ اس لئے ہے کہ کوئی مسلمان اپنے مال کو بیکار نہ پڑا رہنے دے بلکہ اس سے تجارت اور کاروبار کرتا رہے تاکہ ایک طرف تجارت کرے دوسری طرف اس کے محتاج بھائی نفع اٹھائیں اس لئے مسلمانوں کو تجارت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔" اسی طرح ایک معتقد نے پوچھا کہ نکاح کے خرموں کے لوٹنے میں کیا مصلحت ہے کھاتے پینے کی چیزوں کو لوٹنا اور خراب کرنا بڑی غیر مہذب رسم ہے اس کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مولانا نے کہا اظہار مسرت اور تفریح طبع باہمی کے علاوہ اسمیں کتنی بڑی حکمت ہے کہ اگر مجمع زیادہ ہو جائے اور تقسیم میں خرمے پورے نہ پڑیں تو کسی کو شکایت پیدا نہ ہو کہ کسی کو ملا کسی کو نہ ملا غریب آدمی کو اسلام کی یہ پاک تعلیم ذلیل نہیں ہونے دیتی۔

مولانا کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی مجلس میں ایسی جگہ نہ بیٹھتے جہاں سے ان کی شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہو۔ مولانا کی اخوت کے سلسلہ میں مولانا حسن الدین خاموشی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"میں دیہات کے ایک سفر میں مولانا کی معیت میں تھا۔ اتفاق سے سواری ایک تھی میں نے بہت چاہا کہ میں دو چار کوس پیدل چل سکتا ہوں مولانا سواری پر چلیں لیکن مولانا نے ایک نہ مانی اور مجھے مجبور کر دیا کہ ایک میل میں پیدل چلوں اور مولانا سواری پر، پھر مولانا پیدل سفر کریں اور میں سواری کا استعمال کروں۔ نہایت ندامت کے ساتھ مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا فرمایا کہ "حضرت عمرؓ تو غلام کے ساتھ مساوات برتتے تھے۔ کیا یہ ناکارہ اپنے بھائی کے ساتھ بھی ایسا نہ کر سکے گا۔" اس قسم کی احتیاط وہ ہر جگہ رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا کے طرز عمل سے کبھی ایسی بات کا اظہار نہیں

ہوا کہ وہ فی الواقع اپنے کو کوئی بزرگ یا بڑا عالم و مصلح خیال کرتے تھے۔ ان کی عملی زندگی سے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے صوفی بزرگ تھے جو انسانیت کو ولایت و قطبیت سے کم نہ سمجھتے تھے۔ رسالہ ۱۹ میں البشیر اٹاوہ کی اشاعت میں جب مولانا حسن الدین خاموش نے زندہ دلی کے نام سے مولانا پر ایک مضمون لکھا اور ان کی صفات و کرامات بیان کیں تو مولانا نے انہیں لکھا۔

"حضرت خاموش آپ کے قلم کی جولانیاں اب عرصۂ قرطاس اخبار کو تنگ کئے دیتی ہیں کیوں نہ ہو آخر تو ضلع فتح پور کی مٹی سے بنے ہو۔ جہاں کی مردم خیزی کبھی مشہور تھی تم نے زندہ دلی کا فرضی مضمون ایسا لکھا کہ لوگ سچ مچ سمجھ گئے فسانہ نگاری اور ناول نویسی کی یہی صفت ہے۔ کہو تو سہی وہ کون دلی گھنگر ہیں ایسے بھائی ہمارے لئے دعا کرو کہ اللہ ہم کو مسلمان ہی بنا دے۔ ولایت کا گھر تو بڑی دور ہے انسانیت اور مسلمانیت ہی کڑی منزلیں ہیں۔ کہاں کی ولایت کہاں کی قطبیت۔"

مولانا عربی فارسی کے زبردست عالم تھے اور ادب و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور کبھی کبھی اشعار بھی کہتے تھے۔ ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں انہوں نے جو فارسی غزل پڑھی تھی اس کے یہ دو شعر اب تک لوگوں کو یاد ہیں۔

کرد جان و دلم از طرۂ جانانہ جدا — دستِ مشاطہ الٰہی شود از شانہ جدا

برق بر جانِ ہوا داریِ ناموس افتد — تا بہ کے شمع جدا سوزد و پروانہ جدا

عربی و فارسی اور اردو ادب کے علاوہ مولانا کو ہندی شاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خطوں میں ہندی اشعار بھی برجستہ استعمال کرتے تھے۔

شاید اسی ادبی مذاق و صلاحیت کی بنا پر علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ایک ایسے اجلاس میں مولانا سے کہا تھا کہ "آپ کا ادب اس قدر اعلیٰ ہے کہ اگر آپ اس طرف توجہ کرتے مشاہیر مصنفین میں ہوتے۔" لیکن مولانا شعوری طور پر کبھی شعر و سخن کی طرف رجوع نہیں ہوتے انہوں نے جو اشعار کہے ہیں وہ تفریح طبع کے لئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادبیت سے خالی نہیں ہے لیکن ادب کو انہوں نے اپنا مشغلہ نہیں بنایا۔ ان کی ساری کوشش اصلاحی تھی۔ انہوں نے تعلیم و سماجی اصلاح

کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ اسی میں لگے رہے اور حق یہ ہے کہ وہ تنہا اپنی ذات سے جتنا کچھ کر گئے اس کی مثالیں انیسویں صدی عیسوی میں چند ایک سے زیادہ نظر نہیں آتیں۔

افسوس کہ رشد و ہدایت و اصلاح کا یہ چراغ جو برصغیر سے جہالت و تنگ نظری کا اندھیرا دور کر رہا تھا، ۴ مارچ ۱۹۲۷ء بروز جمعہ بوقت ۳½ بجے رات گل ہو گیا۔ مولانا کی وفات سے لوگوں کے دلوں پر کیا گذر گئی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں صرف کیپٹن دلیپ مان سنگھ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈائری کا وہ صفحہ نقل کر رہا ہوں جو انھوں نے مولانا کے وصال کے روز لکھا تھا۔

"آخر کار جو پیش آنی تھی پیش آئی۔ ہمارا عظیم رہبر، مفکر اور دوست تقریباً ۳½ بجے صبح ہم سے رخصت ہو گیا۔ آج جمعہ ہے جو مسلمانوں میں وفات پانے والوں کے حق میں نہایت متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ آج رات کو میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہ سو سکا۔ سردی میں رات بھر کمرے کے باہر صحن میں الگ جاگتا رہا اور روتا رہا تا کہ کوئی مجھے روتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ ان کی وفات سے ہم سب کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا۔ میرے پیارے مولوی صاحب کی زبان پر آخر تک اللہ کا نام رہا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں بڑا بدقسمت پیدا ہوا کہ مجھے ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی وجہ سے ان کی تیمارداری کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ مولوی صاحب کے اہل و عیال کے آنے تک ہم انھیں کے کمرے میں رہے۔[1] ان کی وفات سے دو گھنٹہ پہلے میں نے ان کے قدموں کا بوسہ لیا اور تین مرتبہ اپنی آنکھیں ان کے تلووں سے ملیں۔ اور اپنے لئے سعادت خیال کیا۔ ۵ بجے صبح غسل کرنے کے بعد ہم مولانا کا جنازہ مولانا کے مکان لے گئے۔ اور واپس آ گئے۔ پورے شہر میں مردنی چھائی ہوئی تھی اور ساری دکانیں سوگ میں بند تھیں۔ کفن کے لئے پہلے عمدہ قسم کا نین سکھ خریدا گیا لیکن شہر کے بزازوں نے سودیشی کپڑے کا ایک تھان پیش کیا۔ اور کہا مولانا کے متبرک کفن میں غیر ملکی کپڑے کے بجائے اسے استعمال کیا جائے۔[2] آج میں بالکل نہ

۱۔ مولانا کا وصال لالہ المشد سہائے پدر کیپٹن دلیپ مان سنگھ کے مکان پر ہوا تھا۔

۲۔ مولانا دیسی چیزوں کو زیادہ پسند کرتے تھے اور دیسی مصنوعات کو بیرونی سامان پر ترجیح دیتے تھے بزازوں نے مولوی صاحب کی اس خواہش کے احترام میں دیسی کپڑے کا تھان کفن کے لئے پیش کیا تھا۔

پڑھ سکا۔ ڈیڑھ بجے مولوی صاحب کے گھر گیا اور جنازے میں شرکت کی۔

آدمیوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جی ٹی روڈ سے گذرتا ہوا چوگلیا کے راستے سے جنازہ مدرسہ اسلامیہ کی طرف چلا۔ ہزاروں آدمی جنازے کے ساتھ تھے۔ میں نے اس سے پہلے فتح پور میں اتنا بڑا تعزیتی جلوس کبھی نہیں دیکھا۔ مدرسہ اسلامیہ پہنچتے پہنچتے آدمیوں کا مجمع اور زیادہ ہو گیا۔ مدرسہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مدرسہ کا احاطہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شہر کے سارے ممتاز ہندو اور مسلمان مولوی صاحب کے گھر پر موجود تھے۔ مولوی صاحب کا مزار انھیں کی مسجد میں ان کے والد بزرگوار اور پیارے بیٹے کی قبر سے متصل تیار کیا گیا۔ جس وقت مولانا کا جنازہ راستہ سے گذر رہا تھا لوگ بچوں کی طرح چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ تقریباً ساڑھے چار بجے شام کو مٹی ہوئی۔

جس کمرے میں مولوی صاحب کا وصال ہوا تھا۔ رات کو اسی کمرے میں اسی جگہ سویا لیکن مجھے وہاں کوئی وحشت یا ویرانگی محسوس نہ ہوئی۔ میں نے خواب میں مولوی صاحب کو یہ بھی کہتے سنا کہ میری تجہیز و تکفین میں کوئی رقم خیرات و صدقات کے طور پر نہ لگائی جائے۔[1]

۱۔ اس خواب کے بعد کیپٹن دلیپ مان سنگھ کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں مولانا کے خواب کا اشارہ کفن کے اس سدیشی تھان کی طرف نہ ہو جو ہندو بزازوں نے عقیدتاً پیش کیا تھا۔ اس لئے اس کی قیمت ادا کرنا ضروری سمجھا گیا۔ بزاز کسی طرح قیمت لینے پر رضامند نہ ہوتے تھے لیکن جب انہیں یہ باور کرایا گیا کہ مولانا کی خوشی اسی میں ہے کہ قیمت ادا کر دی جائے تو پھر انہوں نے قبول کر لیا۔ یہ واقعہ مجھ سے دلیپ مان سنگھ نے بیان کیا۔ استاذی مولوی عبدالوحید صاحب استاد فارسی مسلم انٹر کالج نے بھی اس کی تائید فرمائی۔